مُختصَر سوانح

حضرت مولانا محمد یوسُف صاحب رحمۃ اللہ علیہ

ایمان بِالغیب کی دعوت

دعوت میں تاثیر وسعت و قوت

اخلاص وانابت الی اللہ، تجدیدی کام

وقت میں برکت کی ایک مِثال

دینی جنون وبیقراری اور خصوصیات کا ایک اندازہ

تَحریر

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلویؒ

راقم سطور کو اپنی بے بضاعتی اور تہی دامنی کا پورا احساس ہے، لیکن یہ ایک تقدیری بات ہے کہ اس کو ممالک اسلامیہ کی سیاحت اور عالمِ اسلامی سے واقفیت کے ایسے ذرائع اور مواقع میسر آئے جو (بلا کسی تحقیر و تنقیص کے) اس کے ہم وطنوں اور ہم عمروں میں سے بہت کم اشخاص کو میسر آئے ہوں گے، دنیائے اسلام اور بالخصوص ممالک عربیہ کے دینی، علمی اور روحانی حلقوں کو بہت قریب سے دیکھنے اور برتنے کا اتفاق ہوا، دورِ حاضر کی مشکل سے کوئی تحریک اور کوئی عظیم شخصیت ہوگی جس سے ملنے اور سعادت حاصل کرنے کی سعادت حاصل نہ ہوئی ہو۔

اس وسیع واقفیت کی بنا پر (جو کسی کا ذاتی کمال اور سرمایۂ فخر نہیں) یہ کہنے کی جرأت کی جاتی ہے کہ ایمان بالغیب کی دعوت، دعوت کے شغف اور انہماک اور تاثیر کی وسعت وقوت میں اس ناکارہ نے اس دور میں مولانا محمد یوسف صاحبؒ کا کوئی ہمسر اور مقابل نہیں دیکھا، یوں ان کی نادرۂ روزگار شخصیت میں بہت سے ایسے کمالات پائے جاتے تھے جن میں ان کا پایہ بہت بلند تھا، ان کی ایمانی قوت، ان کا اعتماد وتوکل، ان کی ہمت وجرأت ان کی نماز اور دعا، صحابۂ کرامؓ کی زندگی سے ان کی گہری واقفیت اور ان کے حالات کا استحضار، اتباعِ سنت کا اہتمام، فہم قرآن اور واقعاتِ انبیاء علیہم السلام سے عظیم نتائج کا استخراج، دعوت وتصنیف کے متضاد مشاغل کو جمع کرنے کی قوت، اور آخر میں ان کی غیر معمولی محبوبیت اور مقبولیت، یہ سب ان کی زندگی کے وہ پہلو اور نمایاں صفات ہیں، جن کے متعلق بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے، اور جس کے لفظ لفظ کی تصدیق وہ سب لوگ کریں گے جن کو ان کی خدمت میں

کچھ دن رہنے کی سعادت یا کسی سفر میں رفاقت کا شرف حاصل ہوا ہے، اور ان کی تعداد ہزاروں کی ہے، لیکن درحقیقت یہ سب اور ان کے ماسوا اور بہت سے پہلو ان کی سوانح اور سیرت کا موضوع ہیں، اور ان میں سے بعض کمالات و امتیازات وہ ہیں، جن میں ان کے سہیم و شریک مل سکتے ہیں، اور بعض شخصیتیں ان میں ان سے فائق بھی ہوسکتی ہیں، لیکن راقم نے ان کے جن امتیازات کا یہاں انتخاب کیا ہے، ان میں (اپنے محدود واقفیت و علم میں) ان کا کوئی سہیم و شریک اور ان کا کوئی مد مقابل نظر نہیں آتا، والغیب عند اللہ۔

جہاں تک پہلے عنوان کا تعلق ہے، ہم نے غیبی حقائق، اللہ کے وعدوں اور اور انبیاء علیہم السلام کی دی ہوئی اطلاعات پر ایمان لانے اور ان کے اعتماد و یقین پر اپنی زندگی کی کشتی کو چھوڑ دینے کی ایسی واشگاف، طاقتور، اور بے لاگ دعوت کسی دوسری جگہ نہیں دیکھی، جس وقت وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، اس کی قدرت کن فیکون، اس کے بلا شرکتِ غیرے پورے نظام عالم کو چلانے، اسباب کی بے حقیقتی، خواصِ اشیاء اور انسانی تجربات کی بے اعتباری، محسوسات و مشاہدات کو تحقیر و نفی، احکامِ الٰہی اور نظامِ تشریعی کے سامنے نظام تکوینی کی سپر اندازی و مغلوبیت، ایمانی صفات و اخلاق اور اطاعت و عبودیت کے سامنے وسائل و ذخائر کی بے حقیقتی، حاملینِ نبوت اور اہلِ ایمان و دعوت کا اربابِ اقتدار، اہلِ حکومت اور سرمایہ داروں کے مقابلہ میں فتح و غلبہ، خدا کے وعدوں کی ابدی صداقت اور سنۃ اللہ کی ہمہ گیری کا مضمون اپنی پوری ایمانی قوت اور اپنے والہانہ اندازِ بیان میں بیان فرماتے تو سننے والے اتنی دیر کے لیے اس حواس و مادہ پرستی کی دنیا سے منتقل ہوکر ایمان بالغیب کی دنیا میں پہنچ جاتے، اور اسباب و مسببات کا سلسلہ اور مقدمات و نتائج کا ربط و تعلق اتنا بے کار و بے حقیقت نظر آنے لگتا تھا کہ ہم جیسے مدرسی لوگوں کو بعض اوقات اس کی فکر پیدا ہوجاتی تھی کہ کہیں یہ دعوت سننے والوں میں ترکِ اسباب اور تجرد و رہبانیت کا رجحان نہ پیدا کردے، لیکن اس دور مادیت میں جہاں ''اسباب'' نے ''ارباب'' کی شکل اختیار کرلی ہے، اور ایک عالَم کا عالَم اپنی قسمت کو مادی اسباب اور اپنی ذاتی کوشش و قابلیت

کے ساتھ وابستہ کر چکا ہے، اور کسی دینی دعوت و تحریک کو وہ قلندر صفت افراد نہیں مل رہے ہیں، جن کا عشق ''آتش نمرود'' میں بے خطر کود کر عقل کو ''محوِ تماشائے لبِ بام'' کر دے، بلکہ اس تھوڑے سے ایثار اور قربانی کی جنس بھی نایاب ہو گئی ہے، جس کے ایندھن کے بغیر کسی تحریک کی گاڑی دو قدم بھی نہیں چل سکتی، مادی ترقی اور مادی اقدار کی اہمیت و تقدس کی مسلسل اور پر جوش تبلیغ و تلقین نے خود اس امت کو متاثر کر لیا ہے، جس کی ساری طاقت اور جس کی فتح کا راز ایمان بالغیب کی قوت، رضائے الٰہی کی طلب اور جنت کے شوق میں مضمر تھا، مسلمان نے ذرائع معاش کو اپنا رزاق سمجھ لیا ہے۔

مادیت کی اس وبائے عام کے دور میں مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی ایمان بالغیب کی اس دعوت سے بعض اوقات سیکڑوں سامعین کے دل ایمان کے جذبے سے معمور اور قربانی کی لذت سے مخمور ہو جاتے تھے، اور وہ اس کے اثر سے ایثار و قربانی کے ایسے نمونے پیش کرنے لگے تھے، جن کو عقل و دلائل، حکمت و مصلحت اور علم و خطابت کی کسی بڑی سے بڑی طاقت سے حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا، اور جن کی بنیاد پر یہ تحریک دنیا کے دور دراز گوشوں میں پہنچ گئی، ہزاروں آدمیوں نے جن میں ہر طبقے کے لوگ تھے، مہینوں کے لیے گھر بار چھوڑ کر دوسرے براعظموں کا سفر کیا، اور دعوت و تبلیغ کے راستے میں بڑی بڑی مشقتیں برداشت کیں، انھوں نے بڑی دریا دلی اور عالی ہمتی کے ساتھ اپنا وقت اور اپنا مال راہِ خدا میں خرچ کیا، اگر خدا کو منظور ہوتا اور مولانا کی زندگی وفا کرتی تو وہ ایمان بالغیب کی اس طاقت سے (جو اس دور میں مشکل سے کسی اور جماعت کو میسر آئی ہوگی) معاشرے کی اصلاح و انقلاب اور دنیا کے حالات میں تبدیلی کا اور زیادہ وسیع و عمیق کام لیتے اور افراد کی یہ قوتِ ایمانی اجتماعی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتی، ان کی ان مجالس میں کبھی کبھی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مجالسِ وعظ کی جھلک نظر آنے لگتی تھی جن کی (غیر اللہ کی نفی سے لبریز) تقریروں نے ہزاروں دلوں اور دماغوں پر گہری چوٹ لگائی، جس وقت آدمی ان کے ان مواعظ کو (جو فتوح الغیب اور دوسرے مجموعوں میں محفوظ ہیں) پڑھتا ہے تو معلوم

ہوتا ہے کہ ایک شخص پوری بے باکی اور قوت کے ساتھ گرز چلا رہا ہے، اور اس کی ضرب سے مادیت کے ہزاروں بت پاش پاش ہو رہے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم جیسے لوگ جن کا دماغ اسباب ومسببات کے باہمی تعلق سے کبھی آزاد نہیں ہونے پاتا اور جو مادی سعی و جہد کو بھی دین و شریعت میں ایک مقام دیتے ہیں، اور انسان کو اپنی سعی کا مکلّف و مامور سمجھتے ہیں، اور جو اس عالمِ اسباب میں مسلمانوں کی پست ہمتی اور بے عملی کو ان کے زوال کا ایک سبب قرار دیتے ہیں، وہ کبھی مولانا کے اس طرز کی کامیابی کے ساتھ نقل نہیں اتار سکے اور ان کے ذہن نے عین ان مجالسِ وعظ میں بھی اپنا کام کرنا نہیں چھوڑا، لیکن ہم کو اس کا صاف اعتراف ہے کہ ان کی اس دعوتِ ایمانی نے وہ نتائج پیدا کیے جن سے ہماری ''متوازن و معتدل'' دعوتیں (جن کی عصر حاضر کے حقائق پر نظر ہے) قاصر رہیں، اور صاف اندازہ ہوا کہ ؎

لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

ان کا دوسرا امتیاز اپنی دعوت کے ساتھ ان کا ایسا شغف وانہماک تھا، جس کی مثال نہ صرف یہ کہ دینی دعوتوں اور تحریکوں کے میدان میں نظر نہیں آتی بلکہ جہاں تک اس کوتاہ نظر کی نظر وواقفیت کا تعلق ہے کسی مادی وسیاسی تحریک کے داعیوں میں بھی وہ استغراق، خود فراموشی، والہیت اور جذب کی کیفیت نظر نہیں آئی، ان کا یہ پہلو اتنا نمایاں اور اتنا حیرت انگیز تھا کہ جب تک کسی شخص کو کچھ عرصے ان کی خدمت میں رہنے اور کسی سفر میں ان کی معیت کا موقع نہ ملا ہو وہ بہتر سے بہتر تصویر کشی اور واقعہ نگاری کے بعد بھی اس کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا، چند دن رہ کر آدمی ان کی مشغولیت وانہماک اور ان کے جذب واستغراق کو دیکھ کر مبہوت رہ جاتا تھا اور اس کی یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنی قوت وتازگی کہاں سے آتی ہے، اور اس کا سرچشمہ کیا ہے؟ عام حالات میں ''عشق'' اور خاص حالات میں تائیدِ الٰہی اور نصرتِ غیبی کے سوا اس کی توجیہ نہیں ہو سکتی۔

معمولی بات یہ ہے کہ وہ فجر کی نماز کے بعد سال کے بارہ مہینے اور مہینے کے تیس

دن تقریر فرماتے، یہ تقریر ڈھائی تین گھنٹے سے کم نہ ہوتی، اس میں موسم کی سختی، دھوپ کی گرمی، صحت کی خرابی، مجمع کی کمی وزیادتی قطعاً اثر انداز نہ ہوتی، یہ مجاہدہ رمضان المبارک میں بہت بڑھ جاتا، جبکہ فجر کے بعد لوگوں کے سونے کا عام معمول ہے رمضان میں ان کی رات شب بیداری اور دعوت کے کام میں صرف ہوتی، اس کے باوجود فجر کی نماز کے بعد پوری قوت، تازگی اور نشاط کے ساتھ تقریر فرماتے، اور اسی قوت کے ساتھ آخر میں دعوت دیتے، عام دنوں میں چائے کے دوران اور چائے کے بعد پھر گفتگو اور تقریر کا سلسلہ شروع ہوجاتا، عام طور پر وہ جماعتوں کو رخصت کرنے کا وقت ہوتا، وہاں تشریف لے جاکر پھر اسی طرح تقریر فرماتے اور ہدایات دیتے کہ معلوم ہوتا کہ ابھی تک خاموشی کی مہر لگی ہوئی تھی، اور وہ اب ٹوٹی ہے، پھر اسی جذبے اور طاقت کے ساتھ دعا کرتے کہ معلوم ہوتا کہ نہ اس سے پہلے دعا کی ہے، نہ اس کے بعد کریں گے، سب کچھ اسی دعا میں مانگ لینا ہے، اور سب کچھ اسی دعا میں کہہ دینا ہے، اس کے بعد بھی مختلف تقریبوں سے گفتگو اور خطاب کرنے کا سلسلہ جاری رہتا، پھر کچھ دیر تصنیف وتالیف کا کام کرتے، پھر کھانے کا وقت ہوجاتا، ظہر کے بعد پھر کوئی سبق پڑھاتے یا تصنیف وتالیف کا کام کرتے، ملنے جلنے اور ڈاک دیکھنے کا بھی سلسلہ جاری رہتا، کبھی بعد عصر اور بعد مغرب بھی کوئی تقریر ہوجاتی، اور اس میں بھی تازگی اور جوش کا وہی عالم ہوتا، عشاء کے بعد (جو اکثر بڑی تاخیر سے ہوتی) سیرت کی کوئی کتاب یا صحابۂ کرامؓ کے حالات کا کوئی مجموعہ سنانے کا معمول تھا، کتنا ہی تھکے اور جگے ہوئے ہوں اور کیسی خستہ اور شکستہ حالت ہو، اس معمول میں حتی الامکان فرق نہ ہوتا، دیر رات تک یہ سلسلہ جاری رہتا، سننے والے کو محسوس ہوتا کہ اس شخص نے دن بھر آرام کیا ہے۔

ہم جیسے پست ہمتوں کے لیے نظام الدین کا دو روز کا قیام بھی سخت آزمائش اور مجاہدہ تھا، میرا خود حال یہ تھا کہ اکثر اپنے دل سے خطاب کرکے کہتا ”بے ہمت! مولانا کے لیے ساری زندگی کا معاملہ ہے، تیرے لیے صرف دو دن کا معاملہ ہے“ لیکن بہانہ جو اور سہولت پسند طبیعت اپنی صحت کی کمزوری اور مولانا کی عالی ظرفی کا سہارا لے کر کوئی گوشہ

عافیت تلاش کر لیتی، اس وقت اگر کوئی تلاش کرنے والا تلاش کرتا تو خود زبانِ حال سے اس کو اپنا پتہ نشان اس طرح دیتا کہ ؎

ہوگا کسی دیوار کے سایہ کے تلے میرؔ
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

سفر میں تو یہ انہماک اور استغراق بہت بڑھ جاتا، پھر تقریروں کی تعداد، ان کی مقدار اور ان کے اوقات کی کوئی تحدید نہیں تھی، بعض دوستوں نے اندازہ لگایا ہے کہ آخر میں مجموعی طور پر آٹھ آٹھ گھنٹے بولنے کی نوبت آتی۔(۱) اس میں بھی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہر بعد کی تقریر میں نئے سننے والوں کو یہ اندازہ ہوتا کہ بولنے والا اسی وقت بولنے کھڑا ہوا ہے اور اس سے پہلے اس کو اپنے خیالات وجذبات کے اظہار کا موقع نہیں ملا تھا، اب اسی موقع پر اپنا دل کھول کر رکھ دینا چاہتا ہے، یہی ہر وقت کی دعا کی کیفیت ہوتی۔

مجھے حجاز کے آخری سفر میں حاضری کا موقع نہیں ملا، لیکن میں نے بالتواتر سنا ہے کہ وہاں یہ جوش وخروش اور یہ جذبہ وانہماک اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ چکا تھا، مسجد نبویؐ میں صحنِ مسجد میں فجر کی نماز کے بعد تقریر شروع ہو جاتی اور دن چڑھ آتا، اور جن خوش قسمت آنکھوں نے تقریر کے آغاز میں گنبدِ خضرا پر چاندنی دیکھی ہوتی وہ دھوپ چڑھی ہوئی دیکھتے، مجھے یاد ہے کہ بھوپال کے ایک اجتماع میں مولانا نے مغرب کے بعد پوری قوت اور اپنی تقریر کے عام پیمانے کے مطابق بسیط تقریر کی، تقریر کے بعد تشکیل ہوئی، پھر دعا ہوئی، مجھے اطمینان تھا کہ اب اس تقریر کے بعد آرام فرمائیں گے کہ خدا جانے کہ نکاح کی تقریب سے یا کسی اور تقریب سے پھر کچھ بولنا شروع کیا، طبیعت مطمئن تھی کہ چند منٹ میں اس کا سلسلہ ختم ہو جائے گا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد محسوس ہوا کہ مولانا میں نئی تازگی اور جوش آگیا، پھر اس طرح تقریر فرمائی کہ معلوم ہوتا تھا کہ دن بھر خاموش رہے ہیں، اور طبیعت جوش پر ہے۔

یہی حال دعا کا تھا، مولانا کی دعا کی کیفیت، اس کے مضامین، اس کی آمد اور

---

(۱) یہ اندازہ صرف تقریروں کا ہے، مجلسی گفتگوؤں کے اوقات اس کے علاوہ ہیں۔ ۱۲

جوش وخروش، اس کی رقت انگیزی اور اس کی تاثیر، مولانا کے ان خصائص میں سے تھی جن کی مثال دور دور دیکھنے میں نہیں آئی، جب دعا کرتے، حاضرین کا عجب حال ہوتا، خاص طور پر جب اردو میں دعا کے الفاظ ادا فرماتے تو آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آتا، دور دور سے رونے والوں کی ہچکیاں سننے میں آتیں، اس کی مثال ماضی قریب میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے ایک جانشین مولانا سید نصیر الدینؒ کے حالات میں نظر آئی کہ بیان کرنے والوں نے بیان کیا کہ دعا کے وقت رحمتِ الٰہی جوش میں نظر آتی، لوگوں پر ایک وارفتگی اور بے خودی کی کیفیت ہوتی اور بعض لوگ دیوانہ وار جنگل کو نکل جاتے، واقعہ یہ ہے کہ دعا کے وقت جو کیفیت لوگوں پر طاری ہوتی اور جو اثرات ان کے دلوں پر ہوتے، اگر کچھ دیر بھی باقی رہ جاتے تو لوگ دنیا کے کام کے نہ رہتے اور معلوم نہیں حالات میں کیا تبدیلی ہوتی، لیکن نظام عالم اسی طرح چل رہا ہے، اور ہم ضعیف البنیان ہر چیز کا اثر وقتی طور پر لیتے ہیں۔

ان کی تیسری امتیازی خصوصیت جس میں ان کی نظیر ملنی مشکل ہے، ان کی تقریروں اور صحبت کا وہ اثر ہے، جو سامعین وحاضرین پر پڑتا، خاص طور پر ان سلیم طبیعتوں پر جن کا دل ودماغ دوسرے اثرات سے آزاد، اور ان کی طبیعتوں میں تسلیم وانقیاد کا مادہ غالب ہوتا، ان کی کیمیا اثر صحبت اور ان کی انقلاب انگیز تقریروں نے اتنی زندگیوں میں تبدیلیاں پیدا کیں اور اتنے دلوں اور دماغوں کو متاثر کیا کہ جن کا شمار کرنا ممکن نہیں، ان صحبتوں اور تقریروں کے اثرات اتنے گہرے ہوتے کہ صورت، سیرتِ زندگی، معاشرت اور یہاں تک کہ سوچنے اور بولنے کا طریقہ بھی بدل جاتا، سیکڑوں آدمی ہیں جو ان کی زبان بولنے لگے اور ان کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اور جملے ان کو حفظ ہوگئے، کتنے اشخاص ہیں کہ جن کی دعاؤں میں ان کی دعاؤں کا رنگ آگیا، کتنے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور امیرانہ زندگی رکھنے والے لوگ ہیں جن کی زندگی اور معاشرت سرتاپا مغربی اور رئیسانہ تھی، اور وہ اب ایک درویش صفت مبلغ اور ایک فقیر منش اور جفاکش مجاہد نظر آتے ہیں، اور جن کی گرانقدر تنخواہوں اور آمدنیوں کا بڑا حصہ تبلیغ ودعوت، رفقاء کی امداد واعانت اور جماعت کی نصرت

پر خرچ ہوتا ہے، اور ان میں ان کے گھر والوں کا اور ان کا اپنا وہی حصہ ہے جو ایک متوسط ملازم یا ایک اوسط درجے کے تاجر کا ہے، کتنی بڑی تعداد ان رفقاء اور نیاز مندوں کی ہے، جن کی زندگی، جن کا ذوقِ عبادت، جن کا جذبۂ خدمت اور جن کی خشیت و انابت، اور جن کی بے نفسی اور تواضع دیکھ کر اپنے وجود سے شرم آنے لگتی ہے، حقیقی علم تو علام الغیوب کو ہے، لیکن ان کے اخلاص و اخلاق کو دیکھ کر ان کی دینی ترقی اور بلندی کا اندازہ ہوتا ہے، جو زندہ ہیں (خدا ان کی زندگی میں برکت دے) ان کے متعلق کچھ کہنا خلافِ احتیاط ہے "فان الحی لا یؤمن علیه الفتنة (۱)" لیکن جانے والوں میں سے متعدد اصحاب کے نام لیے جا سکتے ہیں، جو ہمارے دیکھتے دیکھتے کہیں سے کہیں پہنچ گئے، اور ان کے حالات اتنے رفیع ہو گئے جن کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

ان میں سے میں صرف اپنے محبوب اور عزیز دوست حاجی ارشد صاحب مرحوم کا ذکر کروں گا جن کا (اپنے اعلیٰ عہدے اور ذمہ داریوں کے ساتھ) اخلاص و للّٰہیت، تعلق مع اللہ، دعوت کے کاموں میں انہماک و استغراق، ایثار و قربانی کی کیفیت، تواضع و انکسار، خدمت کا جذبہ اور پھر اسی راہ کی قابلِ رشک موت اور شہادت برسوں دل کو تڑپاتی اور ان کی یاد تازہ کرتی رہے گی، جاپان میں اشاعتِ اسلام کے کام کا افتتاح اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مقدر فرمایا تھا، اور اہلِ حجاز بھی ان کو عرصے تک یاد رکھیں گے، دنیا کے دور دراز ملکوں میں ایسے لوگ مل جائیں گے، جو مولانا کی چند روزہ صحبت اور دو ایک تقریروں کے سننے سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کی زندگی بدل گئی اور ان کے اندر ایک خاص طرح کے ایمان و یقین کی کیفیت، دعوت کی سرگرمی، دعا کا سلیقہ، نمازوں میں کیفیت اور ایثار کی عادت پیدا ہو گئی، ایسے لوگ ہندوستان اور پاکستان کے باہر امریکہ یورپ اور افریقہ کے برِاعظموں میں بھی ملیں گے۔

جہانے را دگر گوں کرد یک مردِ خود آگا ہے

---

(۱) یہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے الفاظ ہیں، فرمایا کہ دنیا سے چلے جانے والوں کی اقتدا کرو، اس لیے کہ جو زندہ ہے اس کے بارے میں فتنے سے اطمینان نہیں۔

مولانا کی دعوت اور شخصیت اپنے پورے شباب اور عروج پر تھی، ان کی ہمت کا طائرِ بلند پرواز کسی بلند سے بلند شاخ پر بھی آشیانہ بنانے کے لیے تیار نہ تھا، کوئی دور سے دور جگہ ان کو دور، اور کوئی مشکل سے مشکل کام ان کو مشکل نہیں معلوم ہوتا تھا، انھوں نے اپنی تیز رفتاری بلکہ برق رفتاری اور اپنی طبیعت کی بے چینی اور بے تابی سے برسوں کا کام مہینوں میں اور مہینوں کا کام ہفتوں اور دنوں میں کرلیا، اپنے والدِ نامدار کے بعد نئے ملکوں میں جماعتوں کے جانے کا افتتاح کیا اور ساری دنیا کو گھر آنگن بنالیا، حج کا مسئلہ اٹھایا(۱)، اور اس میں ایک نئی روح پھونک دی، اور دیکھتے دیکھتے حجاج کی تعداد اور ان کی کیفیات میں عظیم فرق پیدا ہوگیا، اجتماعات، میوات کے محدود پیمانے سے نکل کر اتنے عظیم اور وسیع بن گئے کہ بڑی بڑی سیاسی کانفرنسیں اور بڑے بڑے پبلک جلسے (مجمع کی کثرت میں بھی) ان کے سامنے ماند پڑ گئے اور ان کی وہ کثرت ہوئی کہ مولانا کے لیے نظام الدین کا قیام مشکل ہوگیا، تبلیغی تقریروں میں غیر مسلموں سے خطاب، حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ، موجودہ مادی زندگی پر تنقید اور فساد کے سرچشمے کی نشاندہی کے باب کا افتتاح کیا، اور ان میں ایسی کشش پیدا کردی کہ سیکڑوں کی تعداد میں غیر مسلم شریک ہونے لگے اور متاثر ہوئے، یہ سب کام بڑی طویل عمر چاہتے تھے، لیکن مولانا نے پچاس برس سے کم عمر اور اپنی ذمہ داری اور دعوت کے صرف بیس سال کے اندر انجام دیئے، اور یہ سب منزلیں طے کرکے اپنے خالق سے جا ملے۔

کام تھے عشق میں بہت، پر میرؔ
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے(۲)

□□□

---

(۱) فریضۂ حج میں روح پیدا کرنے اور اس کو تبلیغ و دعوت کا ذریعہ بنانے کا مسئلہ۔

(۲) ماخوذ از مقدمہ "سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ" تالیف مولوی سید محمد ثانی مرحوم، مقدمہ از قلم ابوالحسن علی ندوی ص ۲۰-۲۸۔